بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

(ان اشارات کا ایک حصہ ترجمان القرآن کے پچھلے شمارے میں شائع ہو چکا ہے)

روس کی اشتراکی حکومت کی اسلام دشمن پالیسی کو دیکھتے ہوئے صاف نظر آتا ہے کہ اسے اسلام اور مسلمانوں کا وجود کسی شکل میں بھی گوارا نہ تھا اور اسے شروع ہی سے اس بات کی فکر دامنگیر تھی کہ جب تک انہیں بالکل ملیامیٹ نہیں کر دیا جاتا اس وقت تک اشتراکیت کا درخت برگ و بار نہیں لا سکتا۔ اسی مقصد کی خاطر روسی حکومت ہمیشہ اس موقع کی تلاش میں رہی ہے کہ کسی طرح مسلم اکثریت کے علاقوں میں غیر مسلموں کو اس انداز سے بسایا جائے کہ یا تو مسلمانوں کی اکثریت باقی نہ رہے یا وہ اپنے گھر میں بھی بالکل غیر مؤثر اور بے وزن بن کر رہ جائیں اور عنانِ اختیار یا توازن اقتدار عملاً غیر مسلموں کے ہاتھ میں منتقل ہو جائے۔

دوسری طرف مسلمانوں کے اندر اشتراکیت کے اثر و نفوذ کے بعد بھی اپنی الگ قومیت کا احساس کسی نہ کسی صورت میں باقی رہا اور وہ ابتدائی چند سالوں میں اس غلط فہمی کے شکار رہے کہ اگر وہ اشتراکیت کے معاشی پروگرام کو اپنا لیں تو زندگی کے باقی معاملات میں اشتراکی ان سے تعرض نہ کریں گے اور وہ اشتراکی نظام کے اندر بھی اپنے قومی تشخص کو برقرار رکھ سکیں گے۔ اشتراکیت کے بارے اس خوش فہمی کے زیر اثر، یا اپنے قومی وجود کے تحفظ کی خاطر روس کی مسلم ریاستوں میں بسماچی تحریک بڑے زور شور سے اُٹھی۔ اشتراکیت کے علمبردار اپنے ناقابلِ بیان مظالم پر پردہ ڈالنے کے لیے اس تحریک کے بارے میں یہ پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ یہ اشتراکیت کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ حالانکہ یہ بات حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ اس تحریک کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ وسط ایشیا کی مسلمان قومیں، جو ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہیں اور ایک

ہی قسم کی تہذیبی روایات کی حامل ہیں، اُن کے درمیان مستقل طور پر رابطہ رہے اور اُن کا الگ قومی وجود کسی طرح برقرار رکھا جا سکے۔ مگر اشتراکیت کو مسلمانوں کا یہ نسلی اور تہذیبی اتحاد بھی گوارا نہ تھا اس لیے انھوں نے اس اتحاد کو بھی پوری قوت کے ساتھ منتشر کرنے کی کوشش کی۔ اس غرض کے لیے انھوں نے ایک عجیب وغریب چال چلی۔ مسلمانوں کو اور پوری دنیا کو یہ تاثر دیا کہ جمہوریتوں میں زرعی انقلاب اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک یورپی رُوس کے ماہرین کو اس انقلاب کی غرض سے مسلمان آبادیوں میں بسایا نہ جائے۔ مگر یہ محض ایک ڈھونگ تھا۔ اس کی اصل غرض یہ تھی کہ مُسلم اکثریت کے علاقوں کو مخلوط آبادیاں بنا دیا جائے تاکہ ان کے اندر اپنے الگ قومی وجود کا احساس یکسر ختم ہو جائے۔ وسطی ایشیا کے ترکستانی اور تاتاری، اشتراکی انقلاب کے وقت جس غلط فہمی کے شکار تھے اس کا اندازہ سٹالن کے ایک بہت بڑے ساتھی ملا نور کے ان احساسات سے لگایا جا سکتا ہے جنہیں ایک تاتاری مصنّف ... کالیموف اُن کا تذکرہ کرتے ہوئے اس طرح لکھتا ہے:

"ملا نور کو اس بات کا یقین تھا کہ اشتراکیت کے مطابق دنیا کی تعمیرِ نو کے بعد عرب تہذیب کا پُوری دنیا کے تمدن پر نہایت گہرا اثر مرتب ہو گا۔ وہ تصورات کی دنیا میں کھو کر اسلامی تہذیب کے اثرات کا عرب سے لے کر ہندوستان کے پُرتر دریائے گنگا تک کا جائزہ لیتے رہتے تھے۔ انہیں اس کے مکمل انتشار بلکہ اس کے یکسر معدوم ہونے کا ذرہ برابر بھی احساس نہ تھا۔"[1]

یہ مسلمان اشتراکی اس زعم میں گرفتار تھے کہ اس انقلاب کے ثمرات کا بیشتر حصہ اُن کی جھولی میں گرے گا۔ چنانچہ ایک تاتاری مُصنّف سلطان گالیف (SULTAN GALIEV) نے اپنے ایک مضمون "قومیتوں کی زندگی" کے عنوان پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا کہ اسلامی مشرق ہی انقلاب کی فتح مندی کی ضمانت ہے۔ تاتاری مشرق اور اسلام ہی صحیح معنوں میں انقلابی قوت ہیں اور ان کا بنیادی مقصد پُوری دنیا میں انقلاب

---

[1] PAN TURKISM AND ISLAM IN RUSSIA — P.182

برپا کرنا نہیں بلکہ یورپی سامراجیوں سے نجات حاصل کرنا ہے[1]۔ روسی اشتراکیوں نے بڑی چالاکی اور عیاری سے مسلمانوں کو اس طرح اپنے ساتھ شامل کر لیا کہ وہ یہ سمجھنے لگے کہ یہ ساری جدوجہد ان کی آزادی اور ان کے تہذیبی اور قومی تحفظ کے لیے کی جا رہی ہے۔ چنانچہ ان مسلمانوں نے اشتراکیت کا ہراول دستہ بن کر خود ہی اپنے آپ کو برباد کیا۔ جب انقلاب آچکا اور ان مسلمان کمیونسٹوں نے حق خود ارادیت کا نام لیا تو سٹالن نے ان کی اس جسارت پر سخت برہمی کا اظہار کیا اور انہیں واضح طور پر بتایا کہ ان کا یہ مطالبہ کسی صورت بھی پورا نہیں کیا جا سکتا۔ سٹالن نے مسلمانوں کو جن الفاظ میں متنبہ کیا ہے وہ آج بھی اس کی تقریروں میں موجود ہیں۔ ہم یہاں ان کا ایک حصّہ نقل کرتے ہیں:

"یہ نیم مختار گروہ (میری مراد تاتاریوں سے ہے) جنہوں نے اپنی قومی کونسلیں قائم کر رکھی ہیں۔ اپنے لیے اس نوعیت کی آزادی کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ مرکزی حکومت ان کے معاملات میں دخل نہ دے اور وہ اپنے مسائل خود طے کریں۔ مگر میں یہ بات بڑے واشگاف الفاظ میں کہنا چاہتا ہوں کہ سویٹ حکومت اس نوعیت کی آزادی کبھی نہیں دے سکتی[2]"

روسی اشتراکیوں نے پہلے تو مسلمان کمیونسٹوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے اس عاقبت اندیش اور دیانتدار طبقے کو برباد کروایا جو اشتراکی انقلاب کے مضمرات کو دینی اور ملی نقطۂ نظر سے اچھی طرح جانتا تھا اور اس کے جلو میں آنے والی تباہ کاریوں کا اپنی بصیرت کی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا تھا۔ پھر جب اس دین پسند طبقے کی راکھ اڑا دی گئی تو اشتراکیت کے علمبردار اُن مسلمان کمیونسٹوں کی طرف متوجہ ہوئے جو مسلم اکثریت کی ریاستوں کے لیے داخلی آزادی کے خواہاں تھے اور تہذیبی اعتبار سے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے آرزومند نظر آتے تھے۔ یہ بدنصیب مسلمان کمیونسٹ جس کرب و اضطراب کے ساتھ اپنی نسل

---

[1] بحوالہ صفحہ سابق

[2] PAN TURKISM AND ISLAM IN RUSSIA P. 183

اور قوم کی بربادی دیکھ رہے تھے اسے ایک تاشتانی کمیونسٹ حسن اسرائیلوف کے مندرجہ ذیل مراسلہ میں دیکھا جا سکتا ہے جو اس نے ۱۹۳۹ء میں روسی حکام کو لکھا تھا:

"روسی حکومت پچھلے بیس سالوں سے طرح طرح کے حیلوں بہانوں سے میری قوم کو فنا کرنے کی کوشش کرتی رہی ہے۔

میری قوم پر کبھی یہ الزام لگایا گیا کہ یہ جاگیردار ہیں۔ کبھی یہ کہا گیا کہ یہ سرمائے کی تجوریاں لے کر بیٹھے ہوئے ہیں اور ان لوگوں پر ڈاکو اور رہزن ہونے کا الزام دہرایا گیا۔ کبھی یہ درمیانہ طبقہ کے وطن پرست قرار دیئے گئے۔ لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ سب کچھ میری قوم کو نیست و نابود کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ چنانچہ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں اپنا سب کچھ اپنی قوم کی آزادی کی خاطر قربان کر دوں گا۔ مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ صرف تاشتان اور انگوش ہی نہیں بلکہ تمام قفقاز (کاکیشیا) کو سرخ استعمار کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے بڑی کٹھن مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔"

اس اقتباس کو بار بار پڑھیے اور تاریخ کے آئینے میں ذرا ان مسلمانوں کا حشر دیکھیے جو اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے اسے مغربی استعمار سے نجات کا ایک مؤثر ذریعہ سمجھ بیٹھے تھے اور اس بات کی توقع رکھتے تھے کہ یہ انقلاب انہیں باہم متحد ہونے میں مدد دے گا۔ مگر جب یہ انقلاب عملاً برپا ہو گیا تو اس نے تاتاریوں اور ترکوں کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔ یورپی روس کی غیر مسلم آبادی کو مسلم آبادیوں میں لا لا کر زبردستی آباد کیا گیا تاکہ ان کی یک جہتی ٹوٹے۔ مثلاً تاجکستان، ترکمانستان اور کرغزستان میں غیر مسلم باشندوں کی جو تعداد ۱۹۲۶ء میں ۲ لاکھ انیس ہزار تھی وہ ۱۹۵۹ء میں ۰۰۰،۴۰۰،۷ تک جا پہنچی۔ ظاہر بات ہے کہ اس تعداد میں اضافے کی وجہ سے مسلم آبادی کا تناسب مسلسل گرنا شروع ہوا۔ ازبکستان میں ازبک آبادی کا تناسب ۷۶ فیصد سے کم ہو کر ۶۲ فیصد ہو گیا۔ اسی طرح ترکمانستان میں ترک آبادی کا تناسب ۱۳ فیصد کم ہوا۔ تاجکستان میں یہ کمی ۳۰ فیصد سے زیادہ تھی۔ کرغزستان میں مسلم آبادی ۶ء۶۶ فیصد سے کم ہو کر ۵ء۴۰ اور قازقستان میں ۶۰ فیصد سے کم ہو کر صرف تیس فیصد

رہ گئی ہے۔[1]

اسلام، مسلم قوم، اس کی روایات اور اس کے تمدن کا یہ حال صرف روس ہی میں نہیں ہوا بلکہ جس جگہ بھی اشتراکیت کو مسلمانوں کے اندر راہ پانے کا موقع ملا ہے وہاں اسلام کا یہی حشر ہوا ہے۔ روس کی اسلام کش پالیسی اور مسلمانوں پر اس کے بے پناہ مظالم کی مدافعت میں بعض اشتراکیوں کی زبان سے یہ دلیل بھی سننے میں آئی ہے کہ "یہ سب کچھ ایک وقتی جوش کے تحت ہوا ہے۔ مسلمانوں کے مذہبی طبقوں نے چونکہ اس نظام کی شدید مخالفت کی تھی اس لیے روس میں اشتراکیت کے علمبرداروں نے اسلام اور مسلمانوں کے معاملے میں کسی حد تک زیادتی بھی کر دی۔ مگر اس تجربے کے بعد جب دوسرے ممالک میں اشتراکی انقلاب برپا ہوگا تو ان میں اسلام دشمنی کی یہ شدت ہرگز نہ ہوگی بلکہ اسلام کو زندہ رہنے اور پھلنے پھولنے کے پورے پورے مواقع فراہم کیے جائیں گے۔" یہ محض خام خیالی ہے۔ اشتراکیت اسلام کو ایک ثانیہ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتی اس لیے دوسرے جن ممالک میں بھی اس نظام کو قدم جمانے کا موقع ملا ہے وہاں اسی طرح اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی کی گئی ہے۔

روس کے بعد اشتراکیت کا نہایت منظم تجربہ چین میں کیا گیا۔ یہ ملک ۲۸ صوبوں پر مشتمل ہے جن میں سے تین صوبوں مشرقی ترکستان، کانسو اور ینان میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ صرف مشرقی ترکستان میں مسلمانوں کی تعداد ایک کروڑ ہے۔

جنگ عظیم سے پیشتر چین میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد کم از کم پانچ کروڑ تھی[2] لیکن چین کی کمیونسٹ

---

[1] STUDIES ON THE SOVIET UNION 1964 P. 28-29

[2] بعض اشتراکی اس تعداد کا بڑا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس تعداد کا ماخذ کیا ہے؟ ان لوگوں کی بےخبری بڑی عجیب و غریب ہے۔ یہ تعداد CHINESE YEARBOOK جو شنگھائی ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی درج ہے پھر اس کی تائید بعض دوسرے موثق ذرائع سے بھی ہوتی ہے۔ امیر شکیب ارسلان اپنی کتاب حاضر العالم الاسلامی میں لکھتے ہیں کہ میں نے سوئٹزرلینڈ میں چینی سفارت خانے کے منشیر سے دریافت کیا کہ چین میں مسلمانوں کی تعداد کیا ہے تو

حکومت کی طرف سے ۱۹۶۱ء میں جو رپورٹ شائع کی گئی ہے اس میں چین کی مجموعی آبادی کو ۶۰ کروڑ بتایا گیا اور اس میں مسلمانوں کی کل تعداد صرف ایک کروڑ ظاہر کی گئی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ۱۹۳۴ء تک تو چین کی آبادی ۴۰ کروڑ ہو اور اس میں مسلمانوں کی تعداد ۵ کروڑ محسوب کی جائے۔ مگر ۱۹۶۱ء میں جب ملک کی آبادی ساٹھ کروڑ تک جا پہنچے تو مسلمانوں کی تعداد صرف ایک کروڑ رہ جائے چین کی آبادی میں جس رفتار سے اضافہ ہوا ہے اس اعتبار سے مسلمانوں کی تعداد کم از کم سات کروڑ ہونی چاہیے تھی۔ آخر وہ چھ کروڑ انسان کہاں غائب ہو گئے؟ کیا انہیں آسمان اُچک لے گیا یا زمین نگل گئی ہے؟ چین اس کا کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ چین کے مختلف سفارت خانوں سے اس مسئلے کے بارے میں کئی افراد نے رجوع کیا ہے مگر کہیں سے بھی کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا۔ صرف ایک ہی رٹا رٹایا فقرہ سننے میں آیا ہے کہ یہ سب سفید سامراج کا پروپیگنڈہ ہے۔ یہ سفید سامراج ایک پردہ ہے جس کے پیچھے سرخ سامراج کا ہر عیب چھپ جاتا ہے!

چین کے مسلمانوں کی معاشی، معاشرتی اور دینی حالت بھی نہایت اچھی تھی۔ چودھویں صدی عیسوی میں ابن بطوطہ نے چین کے ساحلی شہروں کے بارے میں اپنے جو تاثرات بیان کیے ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ چینی مسلمان دینی اعتبار سے بڑے قابلِ تعظیم ہیں۔ انہیں مذہب سے بڑی محبت ہے۔ موجودہ صدی میں امیر شکیب ارسلان اور دوسرے مسلمان مفکرین اور سیاحوں نے چینی مسلمانوں کی اسلام سے گہری محبت کی تعریف کی ہے اور اسے قابلِ رشک قرار دیا ہے۔ خصوصاً سین کیانگ جس کا اصل نام مشرقی ترکستان ہے (مغربی ترکستان روس کے قبضے میں ہے اور مشرقی ترکستان چین کے قبضے میں) کے مسلمانوں کی حالت نہایت اچھی رہی ہے۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اشتراکی انقلاب سے پہلے تک مشرقی ترکستان میں ۳ ہزار ابتدائی مدارس تھے جن میں بچوں کو مفت دینی تعلیم دی جاتی تھی۔ ۶۲ ہائی سکول تھے جو صرف عوامی عطیات کے بل پر چلتے تھے اور اس میں سولہ ہزار طلبہ کی تعلیم کا انتظام تھا۔ اور نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ترکستان کے نام سے ایک اعلیٰ درجے کا ادارہ تھا جس میں آٹھ سو طلبہ پڑھتے تھے۔ تمام کتابیں ترکی زبان میں شائع ہوتی

اُس نے چھ کروڑ بتائی۔ مشہور پادری بروم ہال BROOM HALL نے ۱۹۱۰ء میں چین میں مسلمانوں کی تعداد تین کروڑ بیان کی ہے۔

تھیں۔ رسم الخط عربی تھا[۱]۔ اس علاقے کا مشہور شہر کاشغر اسلامی تہذیب کا بڑا اہم مرکز تھا۔

چینی مسلمانوں کے سلسلے میں یہ بات بھی پوری طرح ذہن نشین رہے کہ روسی اور چینی دونوں مشرقی ترکستان کو ہمیشہ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے ہیں اور انہوں نے ہر موقع پر اس امر کی کوشش کی ہے کہ کسی طرح یہ سرسبز و شاداب علاقہ ان کے قبضے میں چلا جائے اور وہاں سے مسلمانوں کو نکال کر . . . . روسیوں یا چینیوں کو آباد کیا جائے۔ اس ناپاک مقصد کے حصول کے لیے روسی اور چینی اقوام میں بہت سے اختلافات کے باوجود پوری طرح اتفاق رہا اور دونوں نے مل کر اس علاقے کو متعدد بار تاراج کیا۔ مگر انہیں کبھی بھی مستقل تسلط کا موقع نہ حاصل ہو سکا۔ مشرقی ترکستان کے غیور مسلمان برابر اپنی آزادی کے لیے سرفروشانہ جد و جہد کرتے رہے۔ اسی ضمن میں مسلمانوں کی طرف سے آخری کامیاب کوشش ۱۹۳۱ء میں ہوئی جس کے نتیجے میں مشرقی ترکستان چینی تسلط سے آزاد ہو گیا اور وہاں ۱۲ نومبر ۱۹۳۳ء کو اسلامی جمہوریہ کا اعلان کر دیا گیا۔ کاشغر اسلامی جمہوریہ کا دار الحکومت قرار پایا اور الحاج خواجہ نیاز صدر اور علامہ ثابت داملام عبدالباقی وزیر اعظم منتخب ہوئے۔

مشرقی ترکستان کو اسلام کا گہوارہ بنے بارہ صدیاں گزر چکی ہیں۔ اس طویل مدت میں کرۂ ارضی پر بڑے بڑے انقلابات آئے، مگر یہ خطہ اور اس کے بسنے والے لوگ اسلامی تعلق کی بنا پر کفر کی نظر میں، خواہ وہ کسی صورت میں جلوہ گر ہوا، ہمیشہ خار بن کر کھٹکتے رہے اور کفر نے اختلافات کے خارجی مظاہر کے باوجود اسلام کو برباد کرنے اور مسلمانوں کو مٹانے کے لیے بڑی یک جہتی کا ثبوت فراہم کیا۔ روس میں اشتراکی انقلاب سے پہلے بھی اس خطہ کو تاخت کرنے کی شدید خواہش موجود تھی اور اسی کے تحت زار کے عہدِ حکومت میں اس پر کئی بار حملے کیے گئے۔ اشتراکی انقلاب کے بعد بھی جس کا دعویٰ کمزور اقوام کو سامراج کے چنگل سے نجات دلانے کا ہے، روس کے اس رویے میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ چین کا نیشنلسٹ سامراج بھی اس علاقے کا دشمن تھا۔ اور اب اشتراکی چین بھی اس کی بربادی پر اُدھار کھائے بیٹھا ہے۔ مسلمانوں کے مقابلے میں کافرانہ

---

[۱] ڈاکٹر عبدالرحمٰن زکی کی کتاب المسلمون فی العالم الیوم، ج ۴، ص ۰۰۔

طاقتوں کے درمیان کس طرح مکمل اتحاد و اتفاق ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ مشرقی ترکستان کو برباد کرنے کے لیے نہ صرف چین کا نیشنلسٹ سامراج پوری قوت کا مظاہرہ کر رہا تھا بلکہ اس "کارِ خیر میں" غریبوں اور بے کسوں اور مظلوموں کے حامی اشتراکی بھی پوری طرح شریک تھے۔ اشتراکی روس اور اشتراکی چین کو امریکہ کے پروردہ چیانگ کائی شیک اور اس کی نیشنلسٹ حکومت سے جو شدید عداوت اور دشمنی تھی وہ کس سے پوشیدہ ہے۔ مگر مشرقی ترکستان کی اسلامی جمہوریہ کو ملیامیٹ کرنے میں یہ تینوں ایک دوسرے کے مددگار تھے۔

چین کے بہادر مسلمانوں نے اس یلغار کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مگر ان کی کچھ پیش نہ گئی اور بالآخر ۱۲ نومبر ۱۹۴۹ء کو یہ خطہ ماؤزے تنگ کی فوجوں کے تسلط میں آگیا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق آزادی کے تحفظ کے لیے ۱۹۵۱ء تک ایک لاکھ بیس ہزار ترکستانیوں نے اپنی جانیں قربان کیں۔ اس خطے پر اشتراکی چین نے قبضہ کرنے کے بعد اسلام کو مٹانے کے لیے وہی حربے اختیار کیے جو روس میں کیے گئے تھے یعنی الحاد اور بے دینی کو فروغ دینے کی منظم کوشش، مسلم آبادی کا قتل عام اور اس کی ایسے علاقوں کی طرف جلاوطنی جہاں ان کا کوئی وزن باقی نہ رہے۔ مکہ معظمہ کے روزنامہ الندوہ (۱۷ رجون ۱۹۶۸ء) میں ایک ترکستانی مہاجر لکھتا ہے:

"چینی حکومت مشرقی ترکستان کے مسلمانوں پر جو مظالم توڑ رہی ہے اس کی تفصیل بڑی دلخراش ہے۔ صرف ایک مثال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ حکومت کی طرف سے لازم ہے کہ ہر ترکستانی فرد جو ۱۸ سے لے کر ۴۵ سال تک کے درمیان ہو وسطِ چین کے بیگار کیمپوں اور منچوریا کے کارخانوں میں کام کرے۔ اسے اپنے بال بچوں کو ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ کمیونسٹ حکام مردوں کو جبراً کیمپوں میں بھیج دیتے ہیں اور ان کی لڑکیاں چینی نوآبادکاروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ نہ لڑکیوں کی آہ و فغاں پر کان دھرا جاتا ہے اور نہ والدین کی آہیں اثر کرتی ہیں"۔

اسی اخبار میں یہ روح فرسا خبر بھی درج ہے:

۱۹۴۹ء میں جب ماؤ کے سُرخ لشکر مشرقی ترکستان میں داخل ہوئے تو اس وقت وہاں چینیوں کی کل تعداد ۳ لاکھ تھی اور اب یہ تعداد ۳۰ لاکھ ہوگئی ہے اور ابھی چینیوں کو بسانے اور ترکستانیوں کو نکالنے کا سلسلہ جاری ہے۔ ثقافتی انقلاب کے بعد اس تعداد میں مزید اضافہ ہوا ہے۔[۱]

ایک سچّا مسلمان دین کے بارے میں تو حسّاس ہوتا ہی ہے مگر وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سب سے زیادہ نازک جذبات رکھتا ہے۔ اس عالمِ محسوسات میں ایک مسلمان کو جس قدر محبت حضورؐ کی ذاتِ اقدس سے ہوتی ہے وہ کسی اور سے نہیں ہو سکتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی محبت اور عقیدت کے سب سے بڑے مرکز ہیں۔ باقی سب عقیدتیں اسی کی تابع ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ قلبی لگاؤ ایمان کی سب سے بڑی شہادت ہے۔ ایک مسلمان کی نظر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم صرف ایک مصلح ہی نہیں بلکہ منشاء خداوندی کے آخری شارح اور ترجمان ہیں۔ ان کی محبّت سے انسان کے دل و دماغ میں ایمان کی شمع روشن ہوتی ہے۔ اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری سے انسان دنیا و آخرت میں فائز المرام ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے ہاں تصوّف کے کئی سلسلے رائج ہیں اور فقہ کے کئی نظام موجود ہیں، مگر ان کا مطالعہ کرنے سے یُوں محسوس ہوتا ہے کہ ان سب کا مقصد ایک ہی ہے کہ قلب کی گہرائیوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی سچی محبّت راسخ ہو جاتے اور انسانی افعال و اعمال حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیّبہ کا عکس پیش کریں۔

دُنیا کی غیر مسلم قومیں حضورؐ سرورِ دو عالم کے بارے میں مسلمانوں کے ان احساسات سے پوُری طرح واقف ہیں۔ چنانچہ انہوں نے جب بھی اسلام اور مسلمانوں پر حملہ کیا تو سب سے پہلے ہدف حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کی ذاتِ اقدس کو بنایا اور پھر اس بات کا جائزہ لینے کے لیے کہ کفر ان کے اندر کہاں تک سرایت کر چکا

---

[۱] روزنامہ الندوہ ۷ ارجون ۱۹۶۸ء کا یہ اقتباس جناب خلیل حامدی صاحب کی کتاب "سُرخ اندھیروں میں" صفحہ پر درج ہے۔

ہے یہ دیکھا جاتا رہا کہ حضورؐ کے بارے میں ان کے احساسات کہاں تک سرد پڑ چکے ہیں۔ انہیں اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ جو دل حضور سرورِ کائنات کی محبت سے خالی ہو جائے وہ نورِ ایمان سے یکسر محروم ہو جاتا ہے اور اس میں پھر سوائے کفر کی تاریکیوں کے اور کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ مسلمانوں کے اندر کفر پھیلانے کے لیے ان ظالموں نے حضورؐ کے بارے میں یہ تاثر قائم کرنے کی کوشش کی کہ وہ نعوذ باللہ سرمایہ داروں کے ایجنٹ تھے۔ پیکنگ کے روزنامہ "کوانگ منگ جیہ پاؤ" (KWANGMING JIHPAO) کی ۱۰ جنوری ۱۹۵۱ء کی اشاعت میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں نبی آخر الزمانؐ پر نہایت رکیک حملے کیے گئے اور ان میں سے ایک خالص اشتراکی نوعیت کا حملہ یہ تھا:

"تم محمدؐ کے بارے میں یہ تو جانتے ہو کہ اس نے ایک ہاتھ میں تلوار اٹھا رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ میں کتابِ تعلیم۔ مگر تم یہ نہیں جانتے کہ محمدؐ کے ایک ہاتھ میں بندوق تھی اور دوسرے میں تمہارا مال تھا۔"

نعوذ باللہ، مضمون نگار یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ حضور سرورِ کائنات سرمایہ داری کے علمبردار تھے اور وہ دوسرے کی محنت سے ناجائز انتفاع کیا کرتے تھے۔ ان کے فکر و عمل کا محرک غریب طبقوں کی کمائی کو ہتھیا لینا تھا۔[1]

---

[1] اس آسمان کے نیچے اشتراکیوں سے زیادہ بے اصول اور متضاد باتیں کرنے والے لوگ کم ہی ملیں گے جب مسلمانوں کو فریب دینا ہو تو پھر اسلام کا تاریخی کردار یہ پیش کیا جاتا ہے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک درحقیقت اس دور کے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ایک ردِعمل تھا جس نے غریبوں کے حقوق کی محافظت اور پاسبانی کی اور انہیں اس ظالمانہ نظام کی گرفت سے آزاد کرنے کی کوشش کی۔ اس بنا پر اب جو تحریک سرمایہ داری کے خلاف کام کر رہی ہے مسلمانوں کو اس میں شامل ہونا چاہیے۔ لیکن جب اسلام اور مسلمانوں کو برباد کرنا مقصود ہو تو پھر اسی مذہب کو افیونؔ سرمایہ داروں کا ہتھیار اور ظالموں کے محافظ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور اس کا تاریخی کردار بجز اس کے اور کوئی نہیں رہتا کہ اس کی شہ پا کر جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے کمزور طبقوں کی لوٹ کھسوٹ کی۔

چین کے آہنی پردے سے جو خبریں چھن چھن کر باہر آتی ہیں ان سے مساجد اور مکاتب کی حالتِ زار کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ آج سے ایک ہزار برس پیشتر چین میں پانچ ہزار مساجد تھیں۔ ان مساجد کی طرف قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں مسلمان رجوع کرتے تھے۔ لیکن اب ان میں سے بیشتر مساجد یا تو بند کر دی گئی ہیں یا انہیں کارخانوں اور دفاتر میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ چند مساجد باقی رہنے دی گئی ہیں تاکہ غیر ملکی سیاحوں کو دھوکا دیا جا سکے۔ ان مساجد میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے بجائے ماؤ کے نظریات پڑھائے جاتے ہیں۔ انڈونیشیا کے مشہور اخبار دوتا ماشہرکات (DULTA MASHSHARAKAT) میں، جو جکارتہ سے آسا بامانغ کی ادارت میں شائع ہوتا ہے، اس کا تذکرہ یوں کیا گیا ہے:

"مذہبی تعلیم صرف چند مخصوص مسجدوں کے اندر دی جاتی ہے۔ مسلمان بچوں کے اندر روزانہ مادی نظریات کا بیج بویا جاتا ہے۔ ہم نے مسجد ماق میتر کو دیکھا۔ مردوں کے کئی گروہ کمروں میں بیٹھے پڑھائی میں منہمک تھے۔ پہلی نظر میں ہم نے یہ خیال کیا یہ لوگ دین کی تعلیم میں مشغول ہیں۔ مگر بعد میں یہ راز افشا ہوا کہ انہیں اشتراکی نظریات، اشتراکی معاشیات اور ماؤ کی تعلیمات سے بہرہ مند کیا جا رہا ہے۔"

روس اور چین کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی جہاں اشتراکیت کو سرایت کرنے کا موقع ملا ہے وہاں اسلام کے ساتھ یہی افسوسناک سلوک کیا گیا ہے۔ اس وقت بدقسمتی سے دنیائے عرب اس کی لپیٹ میں آچکی ہے۔ مصر، عراق، شام سب اسی کے زخم خوردہ ہیں۔ یہ ممالک کسی وقت اسلامی اتحاد کا قابلِ رشک نمونہ پیش کرتے تھے مگر اب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آتے ہیں۔ کبھی ان ممالک کے باشندوں کو لسانی بنیادوں پر جمع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور کبھی خاکِ وطن سے ان کی قومیت کا خمیر اٹھایا جاتا ہے۔ اور کبھی نسلی تعلق اُبھار کر معاشرے کے مختلف طبقوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کی جدوجہد کی جاتی ہے۔

مگر ان کوششوں میں سے کوئی ایک کوشش بھی کامیاب نہیں ہوئی۔

اہلِ مغرب نے قومیت کا جو تصور دیا ہے وہ جارحانہ ہے۔ اور وہ محبت اور اخوت کے جذبات کے بجائے نفرت کے جذبات سے اپنی قوت فراہم کرتا ہے۔ مثلاً ایک زبان بولنے والوں کو قومیت کے رشتے میں منسلک کرنے کے لیے زبان کے اشتراک کا احساس بھی اگرچہ ضروری ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ جو لوگ اس زبان کے علاوہ دوسری زبانیں بولتے ہیں، اُن سے شدید نفرت کی جائے اور انھیں دنیا سے نیست و نابود کرنے کے دل میں عزائم پائے جائیں۔

اب جبکہ ان عرب ممالک نے اسلام کے رشتے کو چھوڑ کر قومیت کی تشکیل کے لیے دوسرے روابط تلاش کیے ہیں، جنھوں نے ان کے مزاج میں جارحیت اور نفرت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے، تو ان حالات میں یہ بات قطعاً بعید از قیاس نہیں کہ عربوں کا شیرازہ منتشر ہو جائے۔ چنانچہ یہ اندوہناک صورتِ حال ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ وادیٔ نیل کے اتحاد کا خواب شرمندۂ تعبیر ہونے کے بجائے خوابِ پریشاں بن گیا ہے۔ عربوں کی وہ قوتیں جنھیں تعمیری کاموں میں کھپا کر ملّت کو ترقی کی راہ پر لگانا تھا وہ ایک دوسرے کو مٹانے میں صرف ہو رہی ہیں۔ انتشار اور باہمی عداوت کے اس ماحول میں اسلام دشمن طاقتوں کو ان عرب ممالک میں تسلط قائم کرنے کے بہت اچھے مواقع ہاتھ لگے ہیں۔

ان طاقتوں کی شروع ہی سے یہ کوشش رہی ہے کہ یہاں پائیدار اور مستقل غلبے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اسلامی اقدار کا خاتمہ کیا جائے اور جب لوگوں کے قلب و دماغ اور معاشرے میں خلا پیدا ہو جائے تو پھر اس میں شیطان کو بسا دیا جائے۔ متحدہ عرب میں اشتراکیت کے سب سے بڑے علمبردار کرنل ناصر ہیں۔ انھوں نے ۴ نومبر ۱۹۶۱ء میں مصر کا "میثاقِ ملّی" پیش کرتے ہوئے جو ملکی قانون کی اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ مندرجہ ذیل عزائم کا اظہار کیا ہے۔

"مصری انقلاب کے پیشِ نظر مصری سوسائٹی کو قومی، مادی، اشتراکی سوسائٹی بنانا ہے . . . . مصری سوسائٹی اپنے لیے جدید سوشل روابط تلاش کرے گی جو جدید اخلاقی

اقدار پر مبنی ہونگے اور جدید وطنی ثقافت سے ان کا اظہار ہوتا ہوگا ..... میثاق ملی میں فراعنہ کے دور مصر کو انسانی تمدن کی اوّلین بنیاد قرار دیا گیا ہے۔"

اس سلسلے میں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ "عرب سوشلزم" اشتراکیت کی کوئی نئی اور انوکھی قسم نہیں جو عربوں نے اپنے مخصوص حالات اور اپنی قومی اور دینی روایات کو مد نظر رکھ کر تشکیل کی ہو۔ یہ وہی ملحدانہ سوشلزم ہے جس کے تجربات روس اور چین میں کیے جا چکے ہیں۔ جمال عبد الناصر نے اپنے "میثاق" میں اس کا صاف طور پر اعتراف کیا ہے:

"ترقی کا صحیح لائحہ عمل اختیار کرنے کے لیے موزوں اسلوب سائنٹفک سوشلزم ہے۔ کسی اور لائحہ عمل سے یقینی طور پر مطلوبہ ترقی حاصل نہیں ہو سکتی۔"

اور یہ سائنٹفک سوشلزم مارکسزم ہی ہے جس کے مطابق ہر دور کے عقائد و تصورات اخلاقی معیارات اور تہذیب و ثقافت اس عہد کے معاشی حالات خصوصاً پیدائش دولت کے طریقوں کے رہین منت ہوتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں دنیا کا کوئی عقیدہ، کوئی معیار پائیدار قدر و قیمت کا حامل نہیں ہو سکتا، بلکہ پیدائش دولت کے طریقوں کے ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی ادیب بڑے زوردار انداز میں یہ کہتے ہیں کہ "ہر دور کا اپنا قرآن ہے۔"

مصر کے ایک معروف سوشلسٹ ڈاکٹر جمال سعید نے اس حقیقت کو بڑے واشگاف الفاظ میں بیان کیا ہے:

"عرب سوشلزم کا یہ امتیاز نہیں کہ وہ ایک اقتصادی تحریک ہے، بلکہ اس کا یہ امتیاز ہے کہ وہ ایک نظام، ایک انسانی مذہب اور ایک اسلوبِ حیات ہے۔ اس کا مقصد ایک نئے سماج کی تشکیل ہے۔ یہ سوشلزم محض وسائلِ پیداوار کو فرد کی ملکیت سے نکال کر ریاست اور معاشرے کی ملکیت میں دینے کا نام نہیں ہے۔ یہ مجرد قومی اقتصاد پر قبضہ کر لینے اور اسے معاشرے کی بہبود کے لیے مخصوص کر دینے کا نام نہیں ہے۔ یہ محض اجتماعی اور اقتصادی اصلاح تک محدود نہیں بلکہ یہ فرد اور معاشرے کے لیے ہمہ پہلو نظری اور

عملی حل پیش کرتا ہے۔ سوشلزم ایک نئے سماج کی تعمیر کی جدوجہد کا نام ہے۔"

اب ذرا اس نئے سماج کے خد و خال بھی ملاحظہ فرمائیں۔

"عرب تہذیب کی تعمیر جدید اور عرب سماج کی تشکیلِ نو کا واحد راستہ یہ ہے کہ ایک جدت پسند انقلاب پرست اور اشتراکی انسان کو جنم دیا جائے جس کا پختہ ایمان ہو کہ خدا، دین، سرمایہ داری جاگیرداری، سامراج اور وہ تمام قدریں جو آج تک سماج پر مسلط ہیں محض حنوط شدہ لاشیں ہیں اور فقط تاریخ کے میوزیم کی زینت ہیں۔

جب ہم یہ شرط عائد کرتے ہیں کہ جدید انسان کو پچھلی تمام قدریں ردی کی ٹوکری میں اٹھا کر پھینک دینی چاہیں تو اس کے ساتھ ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ ہم مخصوص نوعیت کی نئی قدریں وضع کریں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بنیادی طور پر ایک ہی قدر درکار ہے، اور وہ ہے جدید خود مختار انسان پر ایمانِ مطلق جو صرف اپنی ذات اور اپنے کام اور انسانیت کی خدمت پر بھروسا کرتا ہو۔ اور اسے یقین ہو کہ موت اسی کا حتمی خاتمہ ہے اور موت کے بعد کچھ نہیں ہے۔ جنت اور دوزخ سب افسانے ہیں انسان موت کے بعد ایک ذرے میں تبدیل ہو جاتا ہے اور گردشِ زمین کے ساتھ گردش کرتا رہتا ہے۔ ہمیں ایسے انسان کی ضرورت نہیں ہے جو نمازیں پڑھتا ہو اور ذلیل و عاجز بن کر رکوع میں جھکتا ہو، اپنے لیے رحم اور مغفرت کی طلب میں سرگرداں ہو۔ ہم جس انسان کے ضرورت مند ہیں وہ سوشلسٹ اور انقلاب پسند انسان ہے جس کا ایمان ہو کہ انسان ہی حقیقتِ مطلقہ ہے۔"[1]

یہ ہے وہ نیا سماج جو سوشلزم کے سائے میں دنیائے عرب میں تشکیل پا رہا ہے۔ اشتراکیت کے ان عربی علمبرداروں کے نزدیک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد بھی صرف عرب قومیت کی تجدید و تکمیل تھا۔ انہوں نے زندگی کے معاملات میں جو فیصلے کیے یا انسان کو جن نئی اقدار سے آشنا کیا ان کے پیچھے صرف عرب قومیت کا جذبہ کار فرما تھا اور حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے جس نئے صاحب ایمان

---

[1] یہ اقتباسات خلیل حاوی کی کتاب عالمِ اسلام اور اس کے افکار و مسائل سے لیے گئے ہیں

انسان کو جنم دیا اس کے امتیازی اوصاف یہ نہ تھے کہ اس نے اپنے خالق و مالک کو پہچان کر اس کی اطاعت اور بندگی اختیار کی۔ آخرت کی جوابدہی کے احساس کے پیش نظر اپنے نفس کو خود احکام الٰہی کا پابند بنایا۔ اپنے قلب و دماغ کو باطل خیالات اور اوہام سے پاک کیا اور زندگی کے سارے گوشوں میں پاکیزگی اور خدا ترسی پیدا کی، بلکہ اس نئے انسان کی اصل خوبی یہ تھی کہ اس نے اپنے وطن کے مسائل پر ایمان رکھنے کی تعلیم حاصل کی جس کو غیر کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر ان نئے پُرپیچ طریق سے بیان کر رہا ہے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حضورؐ نہ تو خدا کی طرف سے انسانوں کی رہنمائی کے لیے مبعوث ہوئے ہیں اور نہ انہوں نے انسان کو روحانی اقدار سے لذّت آشنا کیا ہے، بلکہ وہ اپنے عہد کی عرب قوم کے معاشی مسائل میں الجھے رہے اور انہوں نے ان معاشی تقاضوں کو کسی حد تک پورا کرنے کی کوشش کی۔ البتہ اپنے اس اصل مقصد کو ہمیشہ چھپا کر رکھا اور عوام کو اخلاق اور روحانیت کا درس دیتے رہے۔

یہ ہے نام نہاد مسلمان اشتراکیوں کے نزدیک حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا تاریخی کردار اور ان کی تعلیمات کی اصل نوعیت۔

ایک انسان جب روس کے اندر، چین کے اندر اور مسلمان ممالک کے اندر اشتراکیت کا اسلام کے بارے میں یہ معاندانہ رویہ دیکھتا ہے تو اس کے ذہن میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ان ممالک کے معاشی اور معاشرتی حالات میں نمایاں فرق کے باوجود روسی کمیونسٹ، چینی کمیونسٹ اور عرب کمیونسٹ کا دین کے بارے میں انداز فکر بالکل ایک جیسا ہے اور سب اس بات کے دل و جان سے قائل نظر آتے ہیں کہ جب تک اسلام کو پوری طرح ملیامیٹ نہیں کر دیا جاتا اس وقت تک اشتراکیت کا قصر تعمیر نہیں ہو سکتا۔ اشتراکیت کی مذہب دشمنی کسی وقتی ہیجان کا نتیجہ نہ تھی بلکہ یہ سب کچھ اس کے ملحدانہ مزاج کا فطری تقاضا ہے۔ جس طرح نور اور تاریکی یکجا نہیں ہو سکتے، جس طرح حق اور باطل ایک ساتھ پنپ نہیں سکتے، بالکل اسی طرح اشتراکیت اور اسلام ایک ساتھ زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں نظاموں کے اساسی تصورات، ان کے مزاج، ان کے طریقہائے انقلاب، ان کے خوب و ناخوب کے پیمانوں میں کوئی چیز

(باقی ص ۶۴ پر)

(بقیہ اشارات)

بھی ایسی نہیں جسے ان کے مابین قدرِ مشترک کہا جاسکے۔ اشتراکیت خدا کے دین کی بہ نسبت سرمایہ داری سے زیادہ قریب ہے اور ان دونوں نظاموں میں سوائے ایک فرق کے یعنی قومی ملکیت، جس کی حیثیت منزلِ مقصود کی نہیں بلکہ تدبیرِ منزل کی ہے، اور قطعاً کوئی فرق نہیں۔ عقائد اور اصولِ تہذیب اور اخلاق اور طرزِ زندگی میں اشتراکی اور سرمایہ دار بالکل ایک جیسے ہیں۔

اسلام کی پوری عمارت اس تصور پر قائم ہے کہ اس مادی نظام کی اساس ایک اخلاقی اور روحانی نظام پر رکھی گئی ہے۔ اور یہ مادی نظام اُسی صورت میں انسان کے لیے مفید اور کارآمد ہوسکتا ہے جب اس سے اِس اخلاقی اور روحانی نظام کے تحت فائدہ اٹھایا جائے۔ انسانی فطرت خود اس بات کی شہادت فراہم کرتی ہے کہ اس عالمِ مجاز کے پسِ پردہ فی الحقیقت ایک روحانی نظام موجود ہے جو اس کے اندر معنویت اور مقصدیت پیدا کرتا ہے۔ انسان کے دل و دماغ میں اپنے آغاز اور انجام کے بارے میں، اس عالمِ محسوسات سے ماوراء حقائق کے بارے میں جو مختلف سوالات ہمہ وقت اُبھرتے رہتے ہیں وہ اس بات کی ناقابلِ تردید شہادت فراہم کرتے ہیں کہ مادی کائنات اور اس کے محسوس مظاہر کے پسِ پردہ کوئی دوسرا لطیف اور غیر مرئی نظام کارفرما ہے۔

اس اساسی تصور کی وجہ سے اسلام نے خدا، آخرت، جنت و دوزخ، وحی و الہام، فرشتے، بغرض سب اَن دیکھے حقائق کو ایمانیات میں شامل کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک انسان ان حقائق کو دل کی گہرائیوں سے پوری طرح قبول نہیں کرلیتا وہ زندگی کے بارے میں صحیح تصور قائم نہیں کرسکتا۔ پھر اس اخلاقی نظام سے اسلام میں خیر و شر کے پیمانے متعین ہوتے ہیں اور انسان کے اندر یہ احساس اُبھرتا ہے کہ وہ کسی شے یا فعل کی قدر و قیمت مادی سُود و زیاں سے جانچنے کے بجائے اس کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں سے متعین کرے۔

اس کے برعکس اشتراکیت کا پورا نظامِ فکر و عمل اس تصوّر پر قائم ہے کہ یہ عالمِ محسوسات ہی سب کچھ ہے اور زندگی کی ساری قدریں اشیاء اور اعمال کی مادّی افادیت سے متعیّن ہوتی ہیں۔ ان کی اخلاقی اور روحانی اہمیت محض واہمہ ہے۔ مثلاً شراب نوشی سے اگر پیداوار میں اضافہ کیا جاسکے تو اشتراکی نظریہ کے مطابق اس کا استعمال بھلائی کا کام اور اگر اس سے پیداوار کو نقصان پہنچے تو یہ بُرا فعل ہے۔ اس طرح مرد و زن کے آزادانہ اختلاط اور ناچ گانے میں انہماک سے اگر ملکی پیداوار پر بُرا اثر پڑتا ہے تو یہ ناپسندیدہ حرکات ہیں لیکن اگر اس سے مزدور اور کسان تھکاوٹ دُور کر کے زیادہ مستعدی سے کام کر سکیں تو یہ بھلائی کے کام ہیں اور حکومت اور عوام دونوں کو انہیں فروغ دینا چاہیے۔

ان دونوں نظاموں کے اساسی تصورات کے مابین اس واضح اختلاف کو جو لوگ نظر انداز کر کے انہیں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ کبھی بھی صحیح نتائج پر نہیں پہنچ سکتے۔ اشتراکیت کا ابتدائی قدم خواہ بظاہر کتنا ہی بے ضرر بلکہ بعض حالات میں مفید دکھائی دیتا ہو مگر اس کا رُخ لازمی طور پر کفر و الحاد ہی کی طرف ہوگا۔ اور جو کام آغاز میں بھلا معلوم ہو وہ آگے چل کر انسانیت کے خلاف خوفناک سازش کی صورت اختیار کر لے گا۔

دَورِ جدید کا سرمایہ دار واقعی بڑا ظالم ہے۔ اس کے ظلم کا تدارک ضرور ہونا چاہیے۔ مزدور طبقے فی الحقیقت بہت زیادہ ستم زدہ ہیں۔ ان کی دادرسی یقیناً ہونی چاہیے اور انہیں سرمایہ داروں کے مظالم سے نجات ملنی چاہیے۔ جس دل میں اللہ کا خوف اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے وہ انسانیت کی اس ناقابلِ بیان مظلومیت کو آخر کس طرح ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر سکتا ہے۔ غریبوں اور بے کسوں کے سب سے بڑے حامی ہمیشہ انبیاء علیہم السلام رہے ہیں۔ اس بنا پر ایک مسلمان کی حیثیت سے ہم ایک لمحہ کے لیے بھی اس ظلم و استبداد کو برداشت کرنے پر تیار نہیں ہو سکتے جو اس وقت بے کسوں پر کیا جارہا ہے۔ ہم اس بات کے دل و جان سے متمنی ہیں کہ مزدوروں کو ان کے جائز حقوق حاصل ہوں۔ انہیں آزادی اور فارغ البالی نصیب ہو اور وہ سرمایہ داروں کی زیردست آزاری سے محفوظ و مامون ہوں۔ مگر ہم اس بات کو بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ یہاں مزدوروں کے حقوق کے نام پر کفر آئے۔

غریبوں کی امداد کے آڑ میں یہاں الحاد پھیلایا جائے۔

ان لوگوں کو غریبوں اور بے کسوں سے فی الواقع کتنی ہمدردی ہے؟ ہم اس کی حقیقت سے بھی پوری طرح واقف ہیں۔ اگر یہ ہمدردی سچی ہوتی تو انہیں سرمایہ دار ممالک کے مزدور کی مظلومیت کے ساتھ ساتھ روس کے بیگار کیمپ کے ستم کشوں کی مظلومیت کا بھی احساس ہوتا۔ کیا وہ مظلوم اور ستم رسیدہ انسان نہیں جن پر بے پناہ مظالم ڈھائے جا رہے ہیں؟ آخر ان مزدوروں کی مظلومیت اشتراکیوں کے دلوں کے اندر کیوں ارتعاش پیدا نہیں کرتی؟ پھر یہ کس قدر عجیب معاملہ ہے کہ مزدور اور کسان کی ہمدردی کا یہ مروڑ ان لوگوں کے پیٹ میں اٹھ رہا ہے جو خود ہمارے ملک کے بڑے سرمایہ دار اور جاگیردار ہیں۔ جن کوٹھیوں میں وہ رہتے ہیں، جن ہوٹلوں میں وہ ٹھیرتے ہیں، جن کاروں میں وہ پھرتے ہیں، ان کو دیکھیے اور پھر کسان و مزدور کے غم کو دیکھیے جو ہر وقت ان کی زبان سے تراوش کرتا رہتا ہے۔ پھر ذرا جا کر یہ بھی دیکھیے کہ خود اپنی زمینوں کے کاشت کاروں کے ساتھ، اپنے کارخانوں کے مزدوروں کے ساتھ، اور اپنی کوٹھیوں کے ملازموں کے ساتھ ان کا برتاؤ کیا ہے۔

بھارت کی ہندو اکثریت مسلم اقلیت کے معاملے میں گزشتہ بائیس برس سے جس درندگی کا مظاہرہ کر رہی ہے اس پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۸ء تک مسلمانوں کو ایک ہزار سے زیادہ مرتبہ شدید ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اور اب ۱۹۶۹ء میں مسلمانوں کے خون سے جو ہولی کھیلی گئی ہے اس کے تصور سے انسانی روح کانپ اٹھتی ہے۔ معصوم اور نہتے انسانوں کا قتلِ عام، ننھی منی جانوں کی بربادی، عورتوں کی عصمت دری اور ان کے ساتھ انسانیت سوز سلوک، مسلمانوں کی املاک کی تباہی، یہ سب کچھ گھناؤنے جرائم بھارت میں معمولات بن کر رہ گئے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید وہاں کی اکثریت کے ضمیر نے اس ظالمانہ طرزِ عمل کو پوری طرح قبول کر لیا ہے اس لیے اس کے اندر اس کے خلاف کوئی خلش پیدا نہیں ہوتی۔

اس کے یوں تو متعدد وجوہ ہیں مگر دو وجوہات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک ہندو قوم کی تنگ نظری اور تعصب جس نے اس قوم کو انسانی بنیادی صفات مثلاً فیاضی، وسعتِ ظرف، رحمدلی سے محروم کر رکھا ہے۔ دوسرے ذات پات کی وجہ سے نسلی برتری اور تفوق کا غلط احساس۔

مسلمانوں کی اس ملک میں سات صدیوں تک مسلسل حکمرانی ایسی چوٹ ہے جسے ہندو آج تک بھلا نہیں سکا۔ اس کے دل میں مسلم قوم کے خلاف آج تک نفرت کی آگ سلگ رہی ہے۔ پھر پاکستان کی صورت میں جو علاقہ اس کے تسلط میں آنے سے بچ گیا ہے اس کا بھی اسے شدید صدمہ ہے۔ اور وہ بار بار اپنی اس ناکامی کا بے گناہوں سے انتقام لینے کے لیے تیار رہتا ہے۔

احمد آباد اور دوسرے علاقوں میں ہندو نے جس وحشت اور بربریت کا مظاہرہ کیا ہے اسے فی الحقیقت اگر درندوں کی طرف بھی منسوب کیا جائے تو وہ شرم سے اپنا سر جھکا لیں گے اور اس انتساب پر شدید احتجاج کرتے ہوئے چیخ اٹھیں گے کہ ہم درندے ہی سہی مگر ہم اس بھیانک سفاکی سے برات کا اظہار کرتے ہیں۔

ہندو قوم کے اندر اگر کچھ سوچنے سمجھنے والے اہلِ بصیرت موجود ہیں تو انہیں اس زبردست آزاری پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ کمزوروں اور بے کسوں پر ظلم کوئی ایسا کارنامہ نہیں جسے دنیا نے کبھی بھی عزت و احترام کی نظر سے دیکھا ہو یا جسے قدرت نے پسند کیا ہو یا جسے سرانجام دے کر قومیں اقبال مند ہوئی ہوں۔ ظلم ہمیشہ ظالم قوم کی تباہی و بربادی کی علامت ہوتا ہے اور اس تلخ حقیقت کی ناقابلِ تردید شہادت ہوتی ہے کہ اس قوم میں کوئی ایسی انسانی قدر باقی نہیں رہی جس کی بنا پر اُسے دنیا میں زندہ رہنے دیا جائے۔ قومیں ہمیشہ اچھے بنیادی اوصاف سے متصف ہو کر ہی دنیا میں پنپتی ہیں۔ قوموں کی ظالمانہ کارگزاریاں کسی درخشاں باب کا عنوان نہیں بنتیں بلکہ عبرت کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ بھارت کے اربابِ بست و کشاد کو اس مسئلے پر غور کرنا چاہیے کہ کیا وہ اپنی قوم کو سامانِ عبرت کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہیں۔

اس موقع پر ہم انسانیت کے دو بڑے "خیر خواہوں" امریکہ اور روس سے بھی یہ پوچھنا چاہتے ہیں

کہ کیا بھارت کے مسلمان انسان نہیں، کیا ان کا قتل ظلم نہیں۔ آخر ان بے بسوں کی بربادی پر ان دونوں "خیرخواہوں" کے احساسات میں کیوں کوئی تحریک نہیں پیدا ہوتی۔ آخر کیا وجہ ہے کہ وہ کئی سالوں سے اس خونیں ڈرامہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ اسے بھارت کا داخلی معاملہ کہہ کر ان طاقتوں کی معنی خیز خاموشی کے لیے جواز نہیں پیدا کیا جا سکتا کیونکہ ہم نے معمولی معمولی باتوں پر انہیں مختلف ممالک کے داخلی معاملات میں بارہا دخل انداز ہوتے دیکھا ہے۔ عقل یہ بھی باور نہیں کر سکتی کہ امریکہ اور روس بھارت کے سامنے بے بس ہیں۔ وہ بھارت جو اپنے ہر چھوٹے بڑے معاملے کو ان کا اشارۂ ابرو پا کر طے کرتا ہے آخر وہ اس معاملے میں انہیں کس طرح نظر انداز کر سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دو بڑوں کے سیاسی اور معاشی مصالح پر حق و انصاف کا خون کیا جا رہا ہے۔ ان طاقتوں کو بھی اپنے اس غیر اخلاقی، انسانیت کش اور ظالمانہ طرزِ عمل کے سنگین نتائج پر غور کرنا چاہیے۔

پاکستان پر اس سلسلے میں سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیونکہ یہ ملک زیادہ تر بھارتی مسلمانوں کی قربانیوں ہی سے معرضِ وجود میں آیا ہے۔ حکومت کو یہ معاملہ بڑے مؤثر انداز میں اقوامِ متحدہ میں لے جانا چاہیے اور خاص طور پر اسے "معاہدہ نسل کشی" کے تحت جنرل اسمبلی میں اٹھانا چاہیے۔ اس کے علاوہ اس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ساری انسانیت کے ضمیر کو اس ظلم و ستم پر بیدار کرے۔ خصوصاً مسلم ممالک کو بھارتی مسلمانوں کی اس بربادی پر ضرور آگاہ کرنا چاہیے اور انہیں اس صورتِ حال کی سنگینی پر توجہ دلانی چاہیے۔